ڈاکٹر محمود احمد غازی کے نظریہ ریاست وسیاست کا تجزیاتی مطالعہ

Critical analysis of Dr Mehmood Ahmad Ghazi's idea of state and politics

فیاض احمد فاروق[i] ڈاکٹر رضیہ شبانہ[ii]

Abstract:

Allah Almighty created man among the most superior creatures. So that he as may conquer the universe with his peculiar abilities. The first and for most purpose to conquer universe is that the understanding about its secrets can be obtained. Hence different people observed and analyzed to conquer the universe, resultantly different types of knowledge is produced which not only introduced by the scholars but also devised their usage and practical method for positive consultation. Dr Mahmood Ahmad Ghazi is one among these scholars, who absorbed all knowledge, in his educational thought particularly earned name and fame in Islamic knowledge and made this easy comprehensive and beneficial for all the Muslims. His thought has covered all fields of man's life. Although its link is between civilization and culture, economy and sociology and politics. In this thought which is in shape of his writing (Books)before us, he has heighted the ideal way of life in Islamic system. It can be helpful in correcting the modern system of life. In this article we have narrated in detail Ghazi's idea of state and politics as well as its configuration, importance and today how can it be implemented and beneficial is also explained. So that by over renewing the aspects of administration and state organization, these can be improved.

Key words: *Purpose of state, concept of politics, Law, Accountability*

تعارف:

انسان کی تخلیق اس بات کی عکاس ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنا نائب بنا کر اس دنیا میں بھیجا تا کہ وجود کائنات کی عملی تکمیل ہو سکے۔ چناچہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے لیے اس کائنات کو مسخر کر کے اسے اپنی نعمتوں سے بھی مزین کر دیا تا کہ انسان ان نعمتوں سے فائدہ اٹھا کر اپنے خالق و مالک کا شکر بھی بجا لائے۔ لہذا اس بات کی ضرورت بھی تھی کہ ایک طرف تو انسان اللہ تعالی کے احکامات کی تعمیل کرے اور دوسری طرف زندگی گزارنے کے منظم طریقے بھی پیدا کرے۔ یہی وجہ ہے کہ انسانی زندگی کے ارتقاء میں ہمیں پہلے انفرادی اور پھر گروہی نظام زندگی کا تصور ملتا ہے اور جب مختلف گروہوں نے باہم مل جل کر رہنا شروع کیا تو اس سے ہمیں متمدن زندگی کا عکس بھی نظر آنے لگا۔ متمدن زندگی انسان کے فکری اور تہذیبی شعور کی بھی عکاس

[i] ۔پی ۔ایچ ۔ڈی ریسرچ سکالر، شعبہ علوم اسلامیہ، بہاءالدین زکریا یونیورسٹی ملتان۔

[ii] ۔اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ علوم اسلامیہ، بہاءالدین زکریا یونیورسٹی ملتان۔

ہوتی ہے اور اس (متمدن زندگی) کی بہتر تنظیم کے لیے ہمیں ایک ایسے ادارے کی ضرورت پیش آئی جس میں انسانی زندگی کو فکری اور تہذیبی بنیادوں پر باہم مل جل کر گزارا جائے تاکہ انسانی زندگی میں منظم اصولوں کے تحت مزید شعور کو بھی اجاگر کیا جاسکے۔ اس مقصد کی عملی تکمیل کے لیے ہمیں جس ادارے کے قیام کا تصور ملتا ہے اسے ریاست کا نام دیا گیا۔ ایک ایسی ریاست جس میں تمام انسان باہم مل جل کر منظم اصولوں کے تحت اپنی زندگی کو گزار سکیں۔ چناچہ کسی بھی ریاستی نظام میں سیاست و حکومت کا تصور بھی بہت اہمیت کا حامل ہوتا ہے اور کوئی بھی حکومت قانون کے بغیر عملی تقاضوں کی تکمیل بھی نہیں کر سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ ریاستی نظام میں آئین اور قانون کی بالادستی بھی اہم تصور کی جاتی ہے اور حکمرانوں اور رعایا کے حقوق کی پاسداری بھی عملی طور پر اسی سے ممکن ہو سکتی ہے۔

برصغیر پاک وہند کا خطہ کئی حوالوں سے بہت اہمیت کا حامل سمجھا جاتا ہے، کیونکہ یہ خطہ اپنی معاشرتی تنظیم میں کئی مراحل سے گزرا ہے، جس میں مختلف مشاہیر، مفکرین اور اہل علم نے اپنا اپنا کردار ادا کیا ہے۔ اگر ہم برصغیر پاک وہند پر عمومی نظر ڈالیں تو اس خطے میں ایسٹ انڈیا کمپنی کا تصور بڑے واضح انداز میں ملتا ہے۔ یہ وہ دور تھا جب برطانیہ سے کچھ تاجر برصغیر میں تجارتی غرض سے آئے اور پھر اس خطے کی تنظیمی بنیادوں کے مالک بن بیٹھے۔ پھر اس کے بعد شاہ برطانیہ نے بھی اس خطے کو اپنا مرکز و محور بنائے رکھا۔ اقتدار کی حوس میں وہ اس خطے کی عوام کو محکوم رکھنا چاہتے تھے مگر یہاں کے لوگوں نے اس محکومیت کے خلاف اپنی آواز بلند کی اور اس مقصد کی تکمیل میں مذہبی وسیاسی ماہرین کی فکری کاوشوں، جوش اور ولولوں نے آبیاری کی۔

آزاد اور خود مختار ریاستوں میں اقتدار اور اختیارات کی جنگ ہر دور کا خاصا رہی ہے۔ ہر طبقہ اقتدار کی جنگ میں برابری کی بنیادوں پر اپنا حصہ لینا چاہتا ہے، مگر ہر دور میں ایک مخصوص طبقہ اس مساویانہ نظام کو اپنے پاؤں کی زنجیر سمجھتا ہے۔ وہ مخصوص طبقہ اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے تمام مفید اور کارآمد راستوں کو استعمال بھی کرتے رہے ہیں۔ جہاں تک اقتدار و اختیار کا تعلق ہے تو سیاسی جدوجہد میں اقتدار کا تصور ایک مانوس تصور اور فطری تقاضا سمجھا جاتا ہے۔ لیکن جب اقتدار حاصل کرنے کے لیے بلاامتیاز طریقے کو اختیار کرنا واجب مان لیا جائے تو پھر اس کے اثرات انسانی زندگی کے دیگر پہلوؤں پر بھی اثر انداز ہوتے نظر آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اقتدار کے نشے میں اجتماعی مقاصد اور اخلاقیات کو پس پشت ڈال دیتے ہیں جس کی وجہ سے معاشرے کا منظم نظام بھی درہم برہم ہوتا نظر آتا ہے۔

اس فکری سوچ کا اظہار مختلف اہل علم نے کیا ہے جنھوں نے ریاست اور علم سیاست پر کافی سیر بحث گفتگو کی جس کے نتیجے میں بہت سی اہم کتب بھی سامنے آئیں۔ برصغیر پاک وہند کے اہل علم اور مفکرین میں ایک نام پروفیسر ڈاکٹر محمود احمد غازی کا ہے جنھوں نے اپنی علمی اور فکری گذارشات کو محاضرات کی روشنی میں پیش کیا ہے ان کی اس علمی اور فکری گفتگو نے اہل علم کے لیے غور و فکر کے مختلف علوم و فنون کے دروازے کھولے اور تدبر و تفکر کی دعوت عام دی۔ زیر نظر مضمون میں ڈاکٹر محمود احمد غازی کے ریاست و سیاست کے تصورات کا جائزہ لیتے ہوئے عصری تقاضوں کی روشنی میں اس کی اہمیت پر بھی معروضات پیش کی جائیں گی۔

اگر ہم ڈاکٹر محمود احمد غازی کی پوری سیاسی فکر کا مطالعہ کریں تو آپ نے ریاست وسیاست کو چار بنیادی نکات میں بیان کیا ہے۔

۱۔ ریاست کا تصور جس میں ریاست کے بنیادی ڈھانچے کو بیان کرتے ہوئے مقصد ریاست کی وضاحت کی گئی ہے

۲۔ سیاست کا تصور جس میں بنیادی طور مقصد ریاست کی تکمیل کی وضاحت کی گئی ہے

۳۔ حکومت کا تصور جس میں سیاسی نظام کے طریق کار کی وضاحت کرتے ہوئے پہلی اسلامی ریاست سے استشہاد بھی کیا گیا ہے

۴۔ قانون کا تصور جس میں منظم حکومت کے اصول وضوابط بیان کیے گئے اور حکمرانوں کا تصور احتساب شامل ہے۔

انہی بنیادی نکات کا آنے والے صفحات میں مفصل جائزہ لیا جائے گا۔ یہ بات میں واضح کر دوں کہ ڈاکٹر محمود احمد غازی نے اس موضوع پر الگ سے کوئی تصنیف یا خطبہ نہیں دیا مگر انھوں نے اپنے محاضرات اور دیگر تحریروں میں اس پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ جزیرہ نما عرب کے نظام حکومت اور پہلی اسلامی (مدنی) ریاست کو بڑی تفصیل سے بیان کرتے ہوئے استدلال کیا ہے اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے تدبیر مدن کے ضمن میں بھی اس کی بہت اچھے انداز میں وضاحت کی ہے اور حکمرانوں کی جوابدہی سے متعلق ایک ضمیمہ ادب القاضی میں بھی ملتا ہے۔

۱۔ ریاست کا تصور (مقصد ریاست)

ریاست کو تمام بنیادی اداروں میں اولین حیثیت حاصل ہے اور انسانی زندگی کے نشو وارتقاء میں ریاست کو خاص مقام حاصل ہے کیونکہ ریاست تمام معاشرتی اداروں میں بھی کلیدی حیثیت رکھتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس ریاست میں تمام انسان منظم زندگی گزارتے ہیں اور ریاستی تنظیم کے لیے ہمیں سیاست کا تصور ملتا ہے جس میں نظام حکومت کو فوقیت حاصل ہے۔ لہذا سیاسی نظام میں حکومت قائم کی جاتی ہے جس کا بنیادی مقصد یہ ہوتا ہے کہ ریاستی نظم ونسق کا لائحہ عمل ترتیب دیا جائے اور پھر اس پر منظم اور طے شدہ اصولوں کے تحت عمل بھی کیا جائے۔

ریاست کا تصور بہت قدیم ہے جس کا تصور ہمیں ارسطو اور افلاطون کے نظریات میں بھی ملتا ہے جنھوں نے نہ صرف ریاست کے تصور کی بات کی بلکہ اس کی تنظیم کے لیے اصول وضوابط بھی متعارف کرائے۔ مگر اس کے بعد مدینہ منورہ میں باقاعدہ پہلی اسلامی ریاست کی بنیاد ڈالی گئی جس کا تصور آج تک اسلامی ریاست کے حوالے سے چلا آرہا ہے۔

ڈاکٹر محمود احمد غازی لکھتے ہیں کہ اسلامی ریاست جسے ہمارے سیاسی مفکرین نے خلافت وامامت کی اصطلاح سے یاد کیا ہے ایک بھرپور اور ہمہ گیر ریاست ہے۔ قرآن کریم اور سنت نبوی ﷺ میں امت مسلمہ کو جو فرائض اور ذمہ داریاں بطور امت وسط اور خیر الامم سپرد کی گئی ہیں ان کی انجام دہی کا تنظیمی ڈھانچہ ہمارے سامنے خلافت یا امامت کی صورت میں آتا ہے۔ اقامت صلوۃ اور ایتائے زکوۃ سے لے کر حدود وتعزیرات اور بین الاقوامی قانون

تک تمام قرآنی احکامات پر عمل درآمد بحیثیت مجموعی امت مسلمہ کی ذمہ داری ہے اور مسلمانوں کے لیے فرض کفایہ کا درجہ رکھتی ہے یہی وجہ ہے کہ مسلم سیاسی مفکرین نے نصب امامت کو بالاجماع فرض کفایہ قرار دیا ہے۔([1])

جہاں تک اسلامی ریاست کا تعلق ہے تو ڈاکٹر محمود احمد غازی اس کی وضاحت کے لیے شاہ ولی اللہ کے حوالے سے لکھتے ہیں

''اسلامی ریاست سے مراد وہ عمومی اختیار حکمرانی ہے جو نبی کریم ﷺ کی نیابت کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے تاکہ علوم دینی کے احیاء کے ذریعے اقامت دین کا فریضہ پورا ہو، ارکان اسلام قائم ہوں، جہاد اور اس سے متعلقہ امور مثلاً لشکروں کی تربیت و تنظیم، سپاہیوں میں ان کی تنخواہوں وغیرہ کی تقسیم اور فوجوں کے لیے ضروری رقموں کی تخصیص کا انتظام وانصرام ہو۔ عدل وانصاف قائم ہو، حدود اللہ جاری ہوں، ظلم و ناانصافی کا خاتمہ ہو جائے اور لوگوں کو نیکی کا حکم دیا جائے اور برائی سے منع کیا جائے''۔([2])

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ریاست کا ایک مقصد تو دینی فرائض کی تکمیل ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ باہمی اور قانونی معاملات میں عدل وانصاف اور مساوات کے دائرہ کار میں رہتے ہوئے اخلاقی اقدار کی تکمیل کرنا اور انسانی زندگی میں اسلامی صولوں کے مطابق زندگی گزارنے کے شعور کو اجاگر کرنا وغیرہ بھی اسلامی ریاست کے مقاصد میں شامل ہے۔

ڈاکٹر محمود احمد غازی لکھتے ہیں کہ اسلامی ریاست کے حکمران کی دو حیثیتیں ہیں۔ ایک حیثیت جانشین رسول ﷺ کی ہے اور دوسری حیثیت امت کے ناب ہونے کی ہے۔ لہذا ان دونوں کی ذمہ داریوں کی انجام دہی اسلامی ریاست کے حکمران کے ذمے ہے۔ جن کو ہم ذیل میں تقسیم کر سکتے ہیں

۱۔ نظریاتی ۲۔ قانونی ودستوری ۳۔ عسکری ۴۔ مالیاتی

۵۔ اقتصادی اور معاشی ۶۔ اجتماعی ۷۔ ترقیاتی ۸۔ تعلیمی

۹۔ انسانی ۱۰۔ اخلاقی([3])

ریاست کے قیام کے حوالے سے اس کی مزید وضاحت ڈاکٹر محمود احمد غازی'' محاضرات شریعت'' میں اس طرح کرتے ہیں کہ

''اگر ریاست موجود نہ ہو تو اس کی عدم موجودگی سے وہ مشکلات اور مسائل پیدا ہوں گے جو حکومت کے وجود کے بغیر دور نہیں کیے جا سکتے۔ اگر حکومت موجود ہو گی تو امن وامان قائم ہو گا، لوگوں کی جان ومال محفوظ رہے گی۔ اگر حکومت موجود نہ ہو تو معاشرے میں بدامنی ہو گی، قتل و غارت ہو گی، قحط سالی کا سامنا کرنا پڑے گا، صنعتی نظام درہم برہم ہو جائے گا اور ہر شخص جو اپنے گرد قوت جمع کرنے میں کامیاب ہو جائے تو وہ حکمران بن

بیٹھے گا۔لوگوں کی جان ومال کا مالک ہو جائے گا۔ایسی صورت حال میں عامۃالناس کو نہ حصول علم کا موقع ملے گا، نہ سکون سے عبادت کی انجام دہی کے لیے وقت ملے گااور بہت سے لوگ بربادی کا شکار ہو جائیں گے۔([4])

اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ریاستی تنظیم کے لیے جس سیاست وحکومت کا تصور ملتا ہے، ہر دور میں اس ریاستی نظام پر بھی نظر رکھنے کی ضرورت ہوتی ہےاور یہ بھی دیکھنا ہوتا ہے کہ ریاستی نظام کیسے چلایا جارہا ہے، کون لوگ حکمرانی کا فریضہ سرانجام دے رہے ہیں، لوگوں کے بنیادی حقوق کا تحفظ کیسے کیا جارہا ہے۔کہیں ایسا تو نہیں کہ حکمرانی صرف چند ہاتھوں میں سمٹ کر رہ جائے اور لوگوں کو بنیادی ضروریات سے محروم رکھا جائے اور مخصوص طبقہ اختیارات کا مالک بن کر نظام حکومت چلاتا رہے۔اسی پس منظر میں پاکستان کے موجودہ نظام سیاست میں میثاق جمہوریت کو بھی دیکھنے کی ضرورت ہے۔

اسلامی ریاست کا قیام صرف اس لیے ضروری ہے کہ امت کی وحدت کا تحفظ ہو سکے اور اس کی اجتماعی ذمہ داریاں عمدگی سے پوری ہو سکیں۔امت بذات خود مقصد ہے جب کہ ریاست محض اس کی حفاظت اور بقاء کا ذریعہ ہے۔قرآن کریم ریاست اور سیاسی نظم کی اہمیت کو تسلیم کرتا ہے، لیکن وہ اس کی تشکیل کے لیے کوئی واضح حکم نہیں دیتا۔وہ صرف ایسے عام اصول اور معیار بیان کرتا ہے جن کے مطابق اسلامی ریاست کا نظم ونسق چلنا چاہیے۔لہذا اسلامی ریاست کے قیام کی اہمیت ثانوی ہے اور تشکیل امت کی اہمیت اولین ہے۔اسلامی ریاست کا قیام صرف اس لیے ایک مذہبی فریضہ ہے کہ قرآن وسنت نے امت پر جو اجتماعی ذمہ داریاں عائد کی ہیں انہیں پورا کرنے کا اولین ذریعہ ریاست ہے۔

ڈاکٹر محمود احمد غازی امام ابوالحسن الماوردی اور قاضی ابویعلٰی کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ دین کے تحفظ کے لیے ریاست کا وجود ناگزیر ہے۔یہ بات آج کے سیکولر معاشرے کو عجیب معلوم ہوتی ہے، لیکن حقیقت یہی ہے کہ اسلامی نظام میں ریاست اور دین مذہب اور سلطنت دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہیں، دونوں ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں، دونوں ایک دوسرے کے مددگار ہوتے ہیں اور دونوں کے تقاضے ایک دوسرے سے پورے ہوتے ہیں۔([5])

اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مقاصد شریعہ کی تکمیل کے لیے بھی ایک الگ اور خود مختار ریاست کا قیام ضروری ہے، کیونکہ اسلامی شریعت میں زندگی کو منظم گزارنے کے تمام اصول موجود ہیں جن کو اختیار کر کے طرز زندگی کو بہتر بنایا جاسکتا ہے۔اخلاق وآداب کسی بھی معاشرے کے افراد کی زندگی میں نکھار لانے کیے اپنا مثبت کردار ادا کرتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ اسلامی تعلیمات میں اخلاق کی طرف نہ صرف توجہ دی گئی ہے بلکہ بعثت کی تکمیل کے لیے مکارم اخلاق کو بنیادی حیثیت میں شامل کر دیا گیا ہے۔اخلاقی اقدار انسانی شخصیت کے نکھار میں بھی اپنا بنیادی کردار ادا کرتے ہیں۔لہذا اسلامی معاشرے کے اندر ایک ایسی مملکت کا قیام ضروری تھا کہ جس خطے میں اسلامی اخلاقی اقدار کے مطابق زندگی بسر کی جاسکے۔

ڈاکٹر محمود احمد غازی اخلاقی اقدار کے تحت ریاستی قیام کو ضروری سمجھتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

اسلامی ریاست کا قیام ایک اخلاقی ضرورت بھی ہے کیونکہ اس کے بنیادی مقاصد میں یہ امر بھی شامل ہے کہ وہ امت کی اخلاقی اور تہذیبی قدروں کے تحفظ اور بقاء کے لیے اقدامات کرے۔ امت مسلمہ کا اخلاقی معیار قائم رکھنے کے لیے اسلام نے احتساب کا جو ادارہ قائم کیا ہے وہ انسانیت کی معاشرتی تاریخ میں واحد اور بے مثال جدت کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسلامی ریاست ایک معاشرتی تقاضا بھی ہے کیونکہ صرف یہی ایک تنظیم ہے جس کے ذریعے امت اپنے مقاصد وجود کو حاصل کر سکتی ہے امت (یعنی اسلامی معاشرہ) اور خلافت (یعنی اسلامی ریاست) دونوں ایک دوسرے کو سہارا دیتے ہیں۔ امت کے بغیر خلافت کا تصور نہیں کیا جاسکتا اور خلافت کی عدم موجودگی میں کوئی ایسی مادی اور خارجی قوت باقی نہیں رہتی جو امت کی سالمیت کی ضمانت دے سکے۔ ([6])

میں سمجھتا ہوں کہ اسلامی ریاست کا وجود اس لیے بھی ضروری ہے کہ اس میں ریاستی نظام کو بھی شریعت کے تابع بنایا جائے اور طرز زندی میں قانون فطرت کو تسلیم کرتے ہوئے ریاستی قانون میں بھی اس کے عملی نفاذ کو یقینی بنایا جائے۔ اس کے لیے قانونی جواز سے زیادہ اخلاقی اقدار اور اصولوں کو بھی مد نظر رکھا جائے تاکہ انسانی زندگی میں اس کی اخلاقی طاقت قانونی طاقت پر غالب آجائے۔ لہذا اس صورت میں آج بھی انسان کی تمدنی زندگی میں اسلامی معاشرہ دیگر معاشروں پر بھی غالب آسکتا ہے۔

اسلامی ریاست کے بنیادی اصول

اگر ہم ڈاکٹر محمود احمد غازی کی سیاسی فکر کا مطالعہ کریں تو ریاست کے قیام کے لیے وہ جو اصول متعین کرتے ہیں ان کو ہم ذیل میں اس طرح بیان کر سکتے ہیں۔

۱۔ حاکمیت اعلیٰ

اسلامی ریاست کوئی مطلقاً خود مختار ادارہ نہیں، بلکہ اس کا اصلی خود مختار حاکم خالق کائنات ہے، جو کائنات کے خالق اور رب ہونے کی حیثیت سے حاکم مطلق ہونے کا پورا حق رکھتا ہے۔

۲۔ انسان بطور نائب/ خلیفہ

امت مسلمہ کے تمام ارکان اپنے اپنے انفرادی استحقاق کی بناء پر اللہ تعالیٰ کے نائب ہیں، اسی لیے اسلامی ریاست میں مذہبی پروہتوں یا مراعات یافتہ چند افراد کا کوئی طبقہ ظہور پذیر نہیں ہو سکتا۔

۳۔ عوامی نمائندوں کا مسلمان ہونا

اولی الامر (عوامی نمائندے یا ارکان پارلیمنٹ) مسلمان ہونے چاہییں۔ تاکہ وہ اسلامی اصولوں کے مطابق ریاستی نظام کو چلا سکیں اور اسلامی اصولوں کے مطابق عیاستی قانون سازی بھی کر سکیں۔

۴۔ اسلامی قوانین کی پابندی

اسلامی ریاست میں سرکاری احکام، ملکہ قوانین اور قواعد وضوابط کی اطاعت اور پابندی مطلق طور پر بہر صورت واجب نہیں، بلکہ ہمیشہ مشروط اور محدود ہوتی ہے۔ صرف ایسے احکامات اور قوانین کی پابندی واجب ہوتی ہے جو شریعت کے مطابق ہوں۔ اگر کوئی قانونی حکم یا قاعدہ شریعت اسلامی کے خلاف ہو تو نہ صرف یہ کہ اس کی پابندی نہیں کرنی چاہیے بلکہ اسے مسترد کر دینا ہر شہری کا فرض ہے۔

۵۔ قانونی مساوات

قانون کی نظر میں تمام انسان بشمول خلیفہ برابر ہیں۔ چونکہ ہر شخص انفرادی طور پر خلیفہ ہے جس نے اپنا اقتدار واختیار سربراہ ریاست کو سونپ دیا ہے، اس لیے تمام لوگوں کو ہر نقطہ نظر سے برابر ہونا چاہیے۔ کسی کی بڑائی و برتری صرف اس بنیاد پر جانچی جاتی ہے کہ وہ اپنے خالق سے کتنا قریبی تعلق رکھتا ہے۔ جہاں معاشرتی اور قانونی رتبے کا سوال ہے خلیفہ کو عام لوگوں پر قطعاً کوئی برتری حاصل نہیں اس کی حیثیت زیادہ سے زیادہ ایک جیسا مرتبہ رکھنے والے افراد میں اول ہے۔

۶۔ حکمرانوں کا تصور احتساب

امت مسلمہ کا ارکان ہونے کی حیثیت سے اولی الامر اور خلیفہ کی ذمہ داری دگنی ہے۔ ایک طرف تو وہ فرد ہونے کی حیثیت سے اللہ تعالی کے سامنے جوابدہ ہے اور دوسری طرف ان اصل خلفاء کے سامنے جواب دہ ہیں جنھوں نے اسے منتخب کر کے اقتدار کی کرسی پر بٹھایا ہے۔ لہذا اسلامی ریاست میں کوئی بھی حاکم خود کو احتساب سے بالا تر نہ سمجھے۔

۷۔ شورائی نظام

ریاست کے تمام امور شوریٰ کے اصول اور منشاء کے مطابق چلانے چاہییں۔ اور اس کے لیے دور جدید میں پارلیمنٹ کا تصور ملتا ہے۔ ([7])

الغرض ڈاکٹر محمود احمد غازی نے اسلامی ریاست کے بنیادی کردار کی وضاحت کے لیے جن اصولوں کی نشاندہی کی ہے ان میں اقتدار اعلیٰ کا تصور، حکمرانی اور طرز حکمرانی کا تصور، قانون اور نفاذ قانون کا تصور اور قانون سازی اور اس کا طریق کار وغیرہ شامل ہے۔اس کے علاوہ کرامت انسانی، حریت وآزادی، عدل، اعتدال، اخوت ومساوات، اجتماعیت، مسؤلیت، شورائیت، نظم وضبط اور انتظامی صلاحیت شامل ہیں۔

اسلامی ریاست میں انتظامی پہلوؤں کا لحاظ بھی ضروری ہے۔ مثلاً شہروں کی آبادی کس طرح ہو اور کن بنیادی ضروریات کو ملحوظ رکھا جائے جیسے خلیفہ راشد حضرت عمر فاروقؓ نے شہری منصوبہ بندی کے حوالہ سے فرمایا کہ سب سے پہلے ایک جگہ کو شہر کا مرکز قرار دیا جائے، وہاں شہر کی جامع مسجد بنائی جائے جس کے چاروں طرف کھلا میدان ہو، جہاں مسلمانوں کے جمع ہونے کی جگہ ہو، اس میدان کے چاروں طرف بازار ہوں، چاروں طرف چار سڑکیں نکل رہی ہوں، اور وہ چار سڑکیں چار چار چھوٹے چھوٹے مراکز پر جاکر ختم ہوتی ہوں، ان چاروں مراکز کو اس طرح بنایا جائے جیسے بڑے مرکز کو بنایا جائے۔([8])

کسی بھی خطہ میں لوگوں کی عملی زندگی کا دار ومدار اس کی ریاستی تنظیم پر ہوتا ہے، اس لیے کسی بھی ریاست میں انتظامیہ کا کردار بہت اہمیت کا حامل سمجھا جاتا ہے۔ ریاستی ضروریات کو سامنے رکھتے ہوئے منصوبہ بندی کرنا انتظامیہ کا فرض اولین سمجھا جاتا ہے اور پھر ان منصوبوں کو عملی جامعہ پہنانے کے لیے موجود تمام ریاستی وسائل کو بروئے کار لایا جاتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ پاکستان میں انتظامیہ کی طرف سے جو منصوبے سامنے آتے ہیں وہ زیادہ تر سیاسی مفاد کو سامنے رکھتے ہوئے تشکیل دیے جاتے ہیں اور ان سے عوام بہت کم ہی مستفید ہو سکتے ہیں۔ کبھی کبھی تو ایسے منصوبے بھی سامنے آتے ہیں جن منصوبوں کی عوام کو فوری طور پر ضرورت نہیں ہوتی۔ لہذا انتظامیہ کے لیے یہ بات بہت اہمیت کی حامل ہے کی رعایا اور عوام الناس کی ضروریات کو سامنے رکھتے ہوئے منصوبہ بندی کی جائے تاکہ لوگ ان منصوبوں سے زیادہ سے زیادہ مستفید ہو سکیں۔

ڈاکٹر محمود احمد غازی، اسلامی ریاست کی بنیادی روح تین باتوں کو قرار دیتے ہیں۔

۱۔ اللہ کی حاکمیت کا تصور، جس کا لازمی تقاضا انسان کی خلافت کا تصور ہے، جس کو رائے عامہ کے ذریعہ بروئے کار لایا جاتا ہے۔

۲۔ ریاست میں احکام شریعت کی بالادستی ہو

۳۔ جمہور یعنی عامۃ الناس کو حکمرانوں کے عزل ونصب کا اختیار ہو، تاہم اس کا کوئی مخصوص طریقہ اسلام نے متعین نہیں کیا کہ یہ چیز تجربات اور حالات کے بدلنے سے بدلتی رہتی ہے، لہٰذا کوئی بھی ایسا مناسب طریقہ اپنایا جاسکتا ہے جس کے ذریعہ ایسے افراد کی نشاندہی ہو سکے جن پر جمہور کو اعتماد ہو، طریقہ کار کی وسعت کے ضمن میں ڈاکٹر محمود احمد غازی ۱۹۷۹ء کے انقلاب ایران کا حوالہ دیتے ہیں کہ آیت اللہ خمینی نے

عوام کے اعتماد کے بل بوتے پر جب مہدی بازرگان کو وزیر اعظم نامزد کیا تو نہ صرف قوم نے تسلیم کیا بلکہ اسے دنیا بھر میں قبول کیا گیا حالانکہ اس سلسلہ میں کوئی معروف طریقہ انتخاب اختیار نہیں کیا گیا۔([9])

ڈاکٹر محمود احمد غازی ان امور کے حوالہ سے مسلم تاریخ کے تسلسل کی رائے رکھتے ہیں کہ اسلامی تاریخ کے بیشتر ادوار میں پہلی دو باتوں پر عمل ہوتا رہا ہے، تاہم تیسری بات کی بعض اوقات تاریخ میں خلاف ورزی کی گئی ہے۔ تاہم انفرادی خلاف ورزیوں یا انفرادی انحرافات کی وجہ سے اسلامی ریاست کی پوری تاریخ کو اسلام سے انحراف کی تاریخ نہیں کہا جا سکتا۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ ریاست جس کے احکام فقہاء نے بیان فرمائے، جس کی فکری بنیادوں کو مفکرین اسلام نے بیان کیا جس کے عقلی تصورات سے فلاسفہ اسلام نے گفتگو کی، جس کے روحانی تقاضوں پر صوفیاء کرام نے کلام کیا، کسی نہ کسی شکل میں بارہ سو سال تک جاری رہی، اس نظام میں بلاشبہ بہت سی کمزوریاں آئیں، اچھے حکمراں بھی آئے، برے حکمراں بھی آئے، لیکن مسلمانوں نے کبھی بھی اس آئیڈیل کو نظر انداز نہیں کیا، جس آئیڈیل کی بنیاد پر یہ ریاست قائم ہوئی تھی۔([10])

یہاں پر یہ سوال بہت اہم ہے کہ حکمرانوں کی اہلیت کیا ہونی چاہیے، بالخصوص پاکستان میں جو نظام حکمرانی ہے اس میں اہلیت کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی جاتی۔ کسی بھی شخص کو انفرادی تعلقات یا جماعتی بنیادوں پر حکمرانی کے فرائض سونپ دیے جاتے ہیں۔ پاکستان میں جو وزارتوں کا تصور ہے وہ محض سیاسی جماعتوں کی وفاداریوں کے نتیجے میں وزارتوں کا حصول ہوتا ہے۔ وزیر کی بنیادی اہلیت اور اس سے ملک و قوم کو کیا نقصان ہو سکتا ہے اس طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی جاتی۔ پاکستان میں طرز انتخاب بھی ایک سوالیہ نشان ہے جس کو بھی اسلامی اصولوں کی روشنی میں از سر نو دیکھنے کی ضرورت ہے۔

اسلامی ریاست ایک ادارہ وحدت یعنی ایک یونیفائیک فورس ہے۔ جب بھی اور جہاں بھی اسلامی ریاست صحیح اسلامی خطوط پر قائم ہوئی اس نے مقامی اور علاقائی عصبیتوں کو ختم کر دیا۔ اس کی سینکڑوں مثالیں اسلامی تاریخ میں موجود ہیں۔ یہ بات بیسویں صدی میں بھی دیکھنے میں آئی اور ماضی کی تمام صدیوں میں مشاہدہ کی جاتی رہیں ہیں کہ اگر کوئی ایسی قوت رہی ہے جس نے مسلمانوں میں وحدت پیدا کی، جس سے مسلمانوں کو قبائلی، نسلی اور علاقائی عصبیتوں سے بلند کر کے ایک دینی اخوت کی لڑی میں پرویا تو وہ امت مسلمہ سے وابستگی اور امت مسلمہ پر مبنی ریاست تھی۔([11])

اگر ہم پاکستان میں نظام حکومت کی بات کریں تو اس میں بھی ہمیں عصبیت کا تصور ملتا ہے، اس کے ساتھ ساتھ موروثی سیاست اور جاگیر دارانہ نظام سیاست بھی اپنے دور عروج پر نظر آتی ہے۔ سرمایہ دار طبقہ بھی درجہ حکمرانی پر خود فائز سمجھتا ہے۔ اکیسویں صدی میں پاکستانی نظام سیاست میں کوئی بھی متوسط یا غریب طبقہ حکمران بننے کا تصور بھی نہیں کر سکتا، کیونکہ وہ ان اخراجات سے قاصر ہے جو جاگیر دار اور سرمایہ دار حکمرانی کی دعویداری میں خرچ کر دیتے ہیں۔ قرآن کریم نے وحدت امت کا جو تصور دیا ہے اس میں تمام انسان برابر ہیں تو اب ضرورت اس بات کی ہے کہ ایسے

تمام افراد کی فطری صلاحیتوں سے استفادہ کیا جائے اور نظام حکومت میں ایسے افراد کو شامل کیا جائے تاکہ ملک و قوم کو بھی ترقی کی شاہراہ پر گامزن کیا جا سکے۔

اسلامی ریاست کے مقاصد

اسلامی ریاست وہ واحد ریاست ہے جو ایک متعین مقصد، ہر ابہام سے پاک نظریہ اور انتہائی متوازن دستور العمل رکھتی ہے۔ ڈاکٹر محمود احمد غازی نے اسلامی ریاست کے جن فرائض کا ذکر کیا ہے ان کو ہم ذیل میں بیان کر سکتے ہیں

۱۔ فروغ اسلام

ایک ایسی ریاست کا قیام ضروری ہے جس میں اسلامی تعلیمات کو فروغ دیا جا سکے اور ریاستی سطح پر اسلامی عبادات کی تنظیم و ترویج کرنا، بین الاقوامی پیمانے پر اسلامی نظریے کی تبلیغ واشاعت کرنا، قرآن وسنت کے ایسے تمام اوامر کو نافذ کرنا جن کا ریاست کے ذریعے نافذ کیا جانا ضروری ہو۔

۲۔ شرف انسانیت

انسان کو اللہ تعالیٰ نے مکرم بنایا ہے لہذا اس کی عزت نفس کا خیال رکھنا اور اس کی بنیادی ضروریات کو پورا کرنا بھی اسلامی ریاست کے بنیادی مقاصد میں شامل ہے اور اس کے لیے ایسی پالیسیاں اور ریاستی نظام وضع کرنا جس سے انسانیت کی عزت و تکریم ہو اور انھیں بنیادی ضروریات بھی فراہم ہو سکیں۔

۳۔ معاشی نظام کا تحفظ

اسلامی ریاست کے بنیادی مقاصد میں اسلام کے اقتصادی اور مالی نظاموں کا نفاذ، جن کی بنیاد دولت کی منصفانہ تقسیم، سود کے خاتمے اور دولت کے غیر قانونی ارتکاز کی ممانعت وغیرہ، طبقاتی معاشی استحصال کا خاتمہ کرنا وغیرہ شامل ہے۔

۴۔ بنیادی انسانی حقوق کا تحفظ

تمام نوع انسانی کے بنیادی انسانی حقوق کا تحفظ کرنا اور دنیا سے ہر قسم کی ناانصافی ظلم اذیت رسانی اور تشدد و استبداد کے خاتمے کے لیے ہر ممکن طریقے سے مسلسل جدوجہد کرنا اور ان تمام لوگوں کا ہاتھ بٹانا جو اس مقصد کے لیے کام کر رہے ہوں۔ تعلیمی نظام کو اس طرح مرتب کرنا کہ ہر شہری کو اس کے عقیدے، رنگ، نسل یا جنس کا لحاظ کیے بغیر ضروری تعلیم کی ضمانت دی جا سکے۔

۴۔ اقلیتوں کے حقوق کا تحفظ

دیگر مذاہب اور اہل ذمہ کی جان ومال اور آبرو وقار کی مکمل طور پر حفاظت کرنے کے لیے پوری پوری کوششیں بروئے کار لانا وغیرہ

۵۔ قانونی مساوات

دنیا میں ہر اس فرد اور قوم کی مدد کرنا جو کسی بھی قسم کی غلامی، ظلم اور استحصال سے نجات پانے کی کوشش کر رہی ہو۔ امیر اور غریب، طاقت ور اور کمزور کے درمیان قانون کے مطابق فیصلہ کرنا اور کسی بھی شخص کو قانون سے بالا تر تصور نہ کیا جائے۔

۶۔ اخلاقی اقدار کا فروغ

اخلاقی اور تہذیبی اقدار کی ترقی اور ایسا ماحول پیدا کرنا جس میں نیکی پھیلے پھولے اور شرافت وشائستگی عام ہو۔ تمام بداخلاقیوں اور معاشرتی و اخلاقی برائیوں کا خاتمہ ہو۔ ایسا ماحول پیدا کرنا جس میں برائیاں اور بدیاں خود بخود مرجھا کر ختم ہو جائیں۔

۷۔ بین الاقوامی تعلقات

دنیا میں امن اور خوش حالی کی علم برداری کرنا اور دوسری اقوام کو بھی امن وخوش حالی کی طرف دعوت دینا۔ دنیا میں قیام وبقائے امن کے لیے جو تحریک چل رہی ہو اس کی مدد کرنا۔ دنیا میں نیکی اور بھلائی کی ترویج اور بدی کے خاتمے کے لیے ہر فرد، گروہ، جماعت، تنظیم، قوم اور ملک کے ساتھ تعاون کرنا۔

ڈاکٹر محمود احمد غازی ریاست کے مقصد کو شریعت کی بنیادی روح قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں

ریاست کا مقصد اور روح یہ ہے کہ سب سے پہلے تو اللہ تعالیٰ کی حاکمیت پر عمل ہو رہا ہو۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس ریاست میں احکام شریعت کی بالادستی ہو اور شریعت ہی اس ملک میں برتر قانون ہو۔ شریعت سے متعارض کوئی بھی چیز قابل قبول نہ ہو اور ہر چیز کے اچھے اور برے ہونے کا آخری اور حتمی معیار صرف شریعت الٰہی ہو۔ اگر کوئی چیز شریعت کے میزان پر پوری اترتی ہو تو وہ قابل قبول ہے اور اگر شریعت کے میزان پر پوری نہیں اترتی تو وہ قابل قبول نہیں ہے۔ تیسری اور آخری چیز یہ ہے کہ جمہور یعنی عامۃ الناس کو یہ اختیار ہو کہ جس پر وہ اعتماد رکھتے ہوں اور جن کو پسند کرتے ہوں وہی ان کا حکمران ہو اسی طرح ان کو یہ اختیار بھی ہو کہ اگر کسی حکمران کو ناپسند کرتے ہوں تو اس سے جان بھی چھڑا لیں۔ ([12])

ریاست کا قیام اس لیے بھی ضروری ہے کہ کہ اگر ریاست کا وجود نہ ہو تو جہاں ایک طرف بہت سے شرعی احکام پر عمل درآمد رہ جائے گا وہاں معاشرے میں ایسی افراتفری پیدا ہو گی جس سے ہر شخص کے جان و مال خطرے میں پڑ جائے گی۔ لوگوں کی زندگی مشکل ہو جائے گی۔ اس ضمن میں متعدد اہل علم نے ایک قدیم شاعر الافوہ الاودی([13]) کا شعر نقل کیا ہے

لا یصلح الناس فوضی لا سراۃ لہم

ولا سراۃ لہم اذ جہالہم سادوا

عامۃ الناس کے معاملات افراتفری کے ماحول میں درست نہیں ہو سکتے جب ان کا کوئی سربراہ نہ ہو اور اگر جاہل اور غیر مہذب لوگ سردار ہو جائیں تو وہ بھی سردار نہ ہونے کے مترادف ہے۔"

گویا عربوں میں اسلام سے پہلے بھی یہ تصور موجود رہا ہے کہ کسی افراتفری کے عالم میں کوئی معاشرہ اپنا وجود برقرار نہیں رکھ سکتا اور ترقی کے عمل کو، بہتری کے عمل کو اور اصلاح کے عمل کو ریاستی نظم و نسق کے بغیر جاری نہیں رکھ سکتا۔ ریاست یا سیاسی نظام ہر حال میں ضروری ہے۔ اگر جاہل، کم علم، کم فہم، اور غیر مہذب افراد ریاست کی سربراہی اختیار کر لیں تو یہ بھی معاشرتی بربادی کے مترادف ہے۔([14])

اس سے یہ تو واضح ہو جاتا ہے کہ بہتر نظام زندگی کے لیے ریاستی نظم بہت ضروری ہے۔ کوئی بھی معاشرہ اس وقت تک ترقی یافتہ نہیں ہو سکتا جب تک اس معاشرے کے افراد منظم اصولوں کے تحت زندگی نہیں گزارتے۔ لہذا اس بات کی بھی ضرورت ہے کہ اگر معاشرہ تہذیب و تمدن کا گہوارہ اور ترقی یافتہ بنانا ہے تو پھر اہل افراد کا انتخاب کرنا ہو گا تاکہ سیاسی تنظیم میں ایسے افراد حکمرانی کے اعلیٰ عہدوں پر فائز ہوں جو معاشرے کے لوگوں کے بنیادی مسائل کو سمجھتے ہوں، سیاسی مسائل سے واقف ہوں ملک کو درپیش مشکلات سے آگاہ ہوں، ان کی تنظیم کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں اور قانونی تقاضوں سے بھی واقف ہوں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ قانون و ضوابط کو نظر انداز کر کے لوگوں کا معیار زندگی بہتر نہیں بنایا جا سکتا اور پاکستانی لوگوں کا معیار زندگی بہتر بنانے کے لیے ضروری ہے کہ نظام حکومت میں اہل افراد کا انتخاب ہو اور قانون کی حکمرانی کو بھی یقینی بنایا جائے تاکہ ریاستی نظم و نسق کو بھی مثالی بنیادوں پر چلایا جا سکے۔

2۔ سیاست کا تصور (مقصد ریاست کی تکمیل)

جہاں تک سیاست کا تعلق ہے تو کسی بھی ریاست میں ایسا نظام، طریقہ یا اصول جس کے تحت ریاستی تنظیم کی جائے یا نظام حکومت کو چلایا جائے اسے سیاست کا نام دیا جاتا ہے۔ گویا سیاست کا مطلب یہ ہے کہ منظم طریقوں اور اصولوں کے مطابق ریاستی نظام کو چلایا جائے۔ لہذا جدید جمہوری

ریاستوں میں بھی سیاسی نظام کی اہمیت میں اور بھی اضافہ ہو گیا ہے، اس جمہوری نظام میں سیاسی جماعتوں کا تصور ایک واضح مثابن کر سامنے آیا ہے یعنی ایسا نظام جس سے تمام افراد منظم طریقے سے حکومت میں شامل ہونے کے لیے جو طریقہ اختیار کرتے ہیں اسے سیاست کا نام دیا جاتا ہے۔

ڈاکٹر محمود احمد غازی ایک اصطلاح تدبیر ([15]) مدن کی استعمال کرتے ہیں۔ تدبیر مدن سے مراد وہ تمام معاملات ہیں جن کو آج کل ہم علم سیاست کہتے ہیں۔ مفکرین اسلام نے تدبیر مدن کے عنوان سے جو گفتگو کی ہے وہ آج کل دستوریات، سیاسیات اور فلسفہ واخلاق کے بہت سے مباحث پر مشتمل ہے۔([16])

جس کو سیاست مدن کہا جاتا ہے یا جس کے لیے ائمہ اسلام نے تدبیر مدن کی اصطلاح استعمال کی ہے اس میں ملکی اور انتظامی امور بھی شامل ہیں اس میں بڑی حد تک معاشرتی تعلقات اور عوامل بھی شامل ہیں اور بین الاقوامی تعلقات اور لین دین کے معاملات بھی شامل ہیں۔ گویا بین الانسانی معاملات میں جو تعددیت (یعنی کثرت عناصر) ہے وہ بھی تدبیر مدن یا تدبیر ریاست وسیاست میں آتا ہے۔([17])

ڈاکٹر محمود احمد غازی کہتے ہیں کہ تدبیر مدن کے حوالے سے اگر فقہاء کے اسلوب کو دیکھا جائے تو تدبیر مدن کے مضامین کو مرتب کرتے وقت ان کی دل چسپی کا اہم میدان فقہی قوانین اور احکام کو مرتب کرنا تھا۔ انھوں نے ریاست، سیاست اور معاشرت سے متعلق فقہی معاملات میں اجتہاد سے کام لیا اور وہ احکام مرتب کیے جن کا مقصد یہ تھا کہ ریاست اور عامۃ الناس کے درمیان روابط کو منظم کیا جائے، حکمرانوں کی ذمہ داریوں کا تعین کیا جائے اور اسلامی ریاست کے بنیادی قوانین کو منضبط کیا جائے۔ اسلوب فقہاء کے مطابق جن حضرات نے مدن کے مباحث پر غور کیا انھوں نے اس کے لیے احکام سلطانیہ کی اصطلاح بھی استعمال کی، کچھ فقہاء نے اس کے لیے سیاست شرعیہ کی اصطلاح بھی استعمال کی۔ ائمہ اسلام میں سے جن لوگوں نے اس پر کتابیں لکھیں ان میں امام ابو یوسف (کتاب الخراج، امام ابو الحسن الماوردی (الاحکام السلطانیہ) اور امام ابو یعلٰی (الاحکام السلطانیہ) شامل ہیں۔ ان کے علاوہ بدر الدین ابن جماعۃ (م ۷۳۳ھ) ان کی کتاب تحریر الاحکام فی تدبیر اہل الاسلام، پھر آگے چل کر ابن تیمیہ (سیاسۃ الشرعیہ) بھی اس میدان میں بہت نمایاں ہیں۔([18])

اگر ہم اس تمام مواد کا جائزہ لیں تو اس میں بھی ہمیں تین بنیادی باتوں کا تصور ملتا ہے، ان میں ایک ریاست کا تصور، سیاست کا تصور اور نظام حکومت کا تصور شامل ہے۔ نظام حکومت جس کا ہم آنے والے صفحات میں تفصیلی جائزہ بھی لیں گے۔

جہاں تک سیاسی نظام کی تفصیلات کا تعلق ہے تو حقیقت یہ ہے کہ اسلام زیادہ زور اصطلاحات کی بجائے روح اور اصولوں پر دیتا ہے۔ اصطلاحات اگر عمدہ کارکردگی اور معانی کے صحیح فہم میں رکاوٹ نہ بنیں تو ان کی چنداں اہمیت نہیں۔ مثال کے طور پر قرآن کریم مسلمان حکمرانوں کے

لیے ملک (بادشاہ) کی اصطلاح استعمال کرنے میں کوئی حرج محسوس نہیں کرتا۔ وہ اچھے بادشاہوں کا بھی ذکر کرتا ہے اور برے بادشاہوں کا بھی ذکر کرتا ہے۔([19])

یہ بات تو واضح ہے کہ سیاست سے مراد وہ طریقہ یا راستہ جس کے تحت حکومتوں کا نظام چلایا جاتا ہے۔ اسلامی تاریخ میں اس کے لیے ہمیں خلافت اور بادشاہت کا تصور بھی ملتا ہے۔ قبل از اسلام ہمیں جو نظام ملتے ہیں ان میں بھی کوئی منظم طریقہ ہمیں نظر نہیں آتا جس سے یہ واضح ہو کہ یہ کامل نظام ہے اسی کو اختیار کر لیا جائے۔ اس لیے اسلام نے نہ صرف سیاست کو تسلیم کیا بلکہ اس کے لیے اصول وضوابط بھی دیے مگر اس نظام کے کچھ نقائص بھی بیان کر دیے جن کو آج پرکھنے کی ضرورت ہے اور اسی کے مطابق اپنا لائحہ عمل بھی مرتب کرنے کی ضرورت ہے۔

3۔ حکومت کا تصور (سیاسی نظام کا طریق کار)

جہاں تک سیاسی نظام کا تعلق ہے تو انسانی معاشروں کے اجتماعی معاملات کو چلانے کے لیے ایک ایسے نظام کی ضرورت پیش آتی ہے جسے حکومت کا نام دیا جاتا ہے۔ حکومتی مشینری میں عوامی نمائندگی کا ہونا ضروری تصور کیا جاتا ہے۔ قدیم قبائلی جمہوریت میں بھی قبائلی سردار سیاسی حاکمیت کے ذمہ دار سمجھے جاتے تھے۔ عوام الناس کی نمائندگی ایسے افراد کو ملتی تھی جو کسی بھی حوالے سے معاشرے میں نمایاں مقام رکھتے تھے۔ جدید جمہوری سیاسی نظام میں بھی ایسے افراد منتخب ہو کر حکومت کا حصہ بنتے ہیں جو کہ معاشرے میں ایک نمایاں مقام رکھتے ہیں اور پھر منتخب افراد مل کر ریاستی نظام کو چلاتے ہیں جسے حکومت کا نام دیا جاتا ہے۔ کوئی بھی شخص اکیلا پورے نظام کو نہیں چلا سکتا اس لیے ہمیں نظام حکومت میں مختلف وزارتوں کا تصور ملتا ہے جس کے سربراہ کو وزیر اعظم کا نام دیا جاتا ہے اور اس کے معاونین کو مجلس کابینہ (Cabinet) کا نام دیا جاتا ہے۔

جہاں ریاست وحکومت کا تعلق ہے تو اس کی وضاحت کرتے ہوئے ڈاکٹر محمود احمد غازی لکھتے ہیں کہ ریاست اور حکومت اسلام کا مقصد نہیں بلکہ اسلام کی ضرورت ہے۔ اسلام کی منزل نہیں، نشان منزل ہے۔ اسی ضرورت کے تحت نبی کریم ﷺ نے مدینہ میں ریاست قائم فرمائی جو ہمیشہ کے لیے تمام ریاستوں کے لیے ایک نمونہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس ریاست میں جو قوانین نافذ کیے گئے وہ تمام قوانین کا سرچشمہ اور تمام قوانین کے لیے معیار اور مثال کی حیثیت رکھتے ہیں۔([20])

ڈاکٹر محمود احمد غازی اس کی مثال دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ جب نبی کریم ﷺ مدینہ منورہ تشریف لائے تو اس وقت دنیا میں متعدد بڑی بڑی سلطنتیں اور ریاستیں قائم تھیں۔ بعض بڑی بڑی سلطنتوں کے قوانین بھی موجود تھے جن میں آج بھی تحریری طور پر کئی قوانین موجود ہیں۔ لیکن روما اور فارس کے علاوہ ہمارے موجودہ برصغیر میں اور دنیا کے کئی متمدن مقامات پر بڑی متمدن ریاستیں اور حکومتیں قائم تھیں۔ چین میں ترقی یافتہ تمدن اور ریاست کا بھی عربوں کو علم تھا۔ خود جزیرہ نما عرب میں متعدد مقامات پر شمال اور جنوب میں چھوٹی چھوٹی ریاستیں موجود تھیں۔ جو سلطنت روم یا فارس

کے زیر نگیں یا ان کی باجگزار تھیں۔اس لیے عرب ریاست کے وجود سے پورے طور پر آشنا تھے اور انہیں معلوم تھا کہ حکمرانی کیا ہوتی ہے اور بادشاہی کے آداب کیا ہوتے ہیں۔([21])

لہذا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ریاستوں کا وجود تمدنی زندگی کے لیے ضروری ہوتا ہے اور تمام ریاستوں میں اسلامی ریاست اس لیے بہتر ہے کہ اسکا نظام زندگی اور طرز سیاست شرعی اصولوں کے مطابق ہے۔یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے خاص نعمت اور اس کی عنایت ہے کہ اس نے زندگی کو منظم گزارنے کے لیے کچھ اصول دیے اور پھر ان اصولوں کے مطابق زندگی گزارنے کا منہج بھی بتادیا۔لہذا آج اس بات کی بھی ضرورت ہے کہ کہ قرآن کریم نے جس وحدت امت کا تصور دیا ہے اس کو بھی اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔بالخصوص پاکستان میں جن مسائل (عصبیت فرقہ واریت، اور انتہا پسندی) کا سامنا ہے اس تمام کا حل بھی اسی وحدت میں موجود ہے۔چناچہ اسلامی ریاست میں تحمل، برداشت اور رواداری کے عمل کو فروغ دینے کی بھی ضرورت ہے۔

جہاں تک اسلامی ریاست میں حکومت کے تصور کی بات ہے تو ریاست نظم ونسق کو چلانے کے لیے جن افراد اور طریق کار کی ضرورت ہوتی ہے اسے حکومت کا نام دیا جاتا ہے اور حکومت کے اندر انتظامیہ کا تصور قابل ذکر ہے۔انتظامیہ سے مراد وہ تمام افراد جو ریاستی نظم ونسق کو کنڑول کرتے ہیں جن میں ایک سربراہ حکومت ہوتا ہے جسے وزیر اعظم کا نام دیا جاتا ہے اور باقی اس کے مددگار ہوتے ہیں جنھیں وزراء کا نام دیا جاتا ہے۔یہ تمام مل کر ریاستی نظم ونسق کو چلاتے ہیں اور اپنی آئینی اور قانونی ذمہ داریوں سے عہدہ برأ ہوتے ہیں۔

اگر ہم قبل از اسلام عربوں کے نظام حکومت پر نظر ڈالیں تو اگرچہ وہاں قبائلی نظام تھا مگر وہاں پر بھی نظم حکومت کا تصور ملتا ہے، جس کی وضاحت کرتے ہوئے ڈاکٹر محمود احمد غازی لکھتے ہیں کہ جزیرہ نما عرب میں قبائلی نظام موجود تھا اسی وجہ سے یہاں کے اصل باشندے قبائلی نظام سے مانوس تھے، کیونکہ اس سے پہلے عربوں کے ہاں کوئی متمدن ریاست قائم نہیں ہوئی تھی۔ہر قبیلہ اپنی جگہ آزاد خود مختار یونٹ کے طور پر کام کرتا تھا۔جو قبیلہ جتنا بڑا ہوتا تھا اتنا ہی اس کا اثر رسوخ ہوتا تھا۔قبائل میں عام طور پر فیصلے عامۃ الناس کی مرضی اور جمہور کی رضامندی سے کیے جاتے تھے۔جس شخص کو قبیلہ کا سربراہ چنا جاتا تھا وہ اکثر اپنے قبیلے کا سب سے نمایاں اور بعض حالات میں سب سے معمر فرد ہوتا تھا۔سربراہ قبیلہ کی ذاتی صلاحیتیں اور اس کا شخصی کردار اس کے انتخاب میں فیصلہ کن حیثیت رکھتا تھا۔([22])

یہ سمجھنا درست نہیں کہ عربوں کے ہاں قبائل کے اندر کوئی باقاعدہ نظم ونسق نہیں ہوتا تھا۔جاہلی ادب اور دور جاہلی کی تاریخ سے پتا چلتا ہے کہ ہر قبیلہ ایک بہت منظم یونٹ ہوا کرتا تھا۔اکثر قبائل میں مضبوط داخلی تنظیم موجود تھی۔اس داخلی تنظیم میں ہر دس افراد پر ایک عریف مقرر ہوتا تھا۔یہ عریف اپنے دس افراد کی ہر چیز کا ذمہ دار ہوتا تھا۔ان کے تمام معاملات اور ضروریات کی ذمہ داری اس عریف کی ہوتی تھی۔ہر دس عریفوں کے اوپر

یعنی سو آدمیوں کے اوپر ایک نقیب مقرر ہوتا تھا۔ نقیب اپنے ماتحت عرفاء کے ذریعے بقیہ لوگوں کا ذمہ دار ہوتا تھا، اور یوں ۱۱۰ آدمیوں کی ذمہ داری نقیب کے سپرد ہوتی تھی ۔ نقیب کے اوپر بھی ذمہ دار اور عہد یدار ہوتے تھے ۔ ہر قبیلہ میں اس کا تذکرہ ملتا ہے۔ عریف اور نقیب کا یہ ادارہ نبی کریم ﷺ کے زمانے میں بھی قائم رہا۔ اس کو آپ نے مزید پختہ بھی بنایا۔ عریف اور نقیب کے علاوہ ایک اہم ادارہ ولاء یا موالات کا ہوتا تھا۔ اس ادارہ کے ذریعہ قبیلہ سے باہر کا آدمی قبیلہ کی رکنیت حاصل کر سکتا تھا اور رکنیت کے حقوق اور ذمہ داریوں میں دوسرے افراد قبیلہ کے ہم پلہ شمار ہوتا تھا۔ اسلام نے اس ادارہ کو بھی نہ صرف برقرار رکھا بلکہ مزید بہتر بنایا۔ اس ادارہ نے اسلام کی وسیع اشاعت اور اسلامی معاشرہ کی توسیع کے دور میں اسلامی معاشرہ کے اندرونی استحکام میں اہم کردار ادا کیا۔ ([23])

قصی کی قائم کردہ ریاست میں پہلے دس شعبے قائم تھے اور ان کو قریش کے دس قبائل میں تقسیم کیا۔ پھر وقت کے ساتھ ساتھ مزید شعبے قائم ہوتے گئے جو مختلف قبائل میں تقسیم کیے جاتے رہے۔ یوں کل اکیس عہدے قائم ہوئے۔ ہر قبیلہ کا سربراہ پیدائشی اور خاندانی طور پر اس عہدے کا حامل بھی ہوتا تھا، جو اس خاص قبیلے کا عہدہ تھا۔ ([24])

گویا اس سے معلوم ہوا کہ جزیرہ نما عرب میں بھی نظام حکومت موجود تھا جس مین مختلف عہدوں کا بھی تصور ملتا ہے اور ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے ان عہدوں کی تفصیل بھی بیان کی ہے۔

جب نبی کریم ﷺ نے مدینہ میں اسلامی ریاست کی بنیاد رکھی تو اس ریاست میں مختلف شعبے قائم فرمائے۔ ہم آج کل کی اصطلاح میں کہہ سکتے ہیں کہ ایک صیغہ خاص تھا۔ ایک توقیعات و فرامین اور دستاویزات کا شعبہ تھا۔ ایک شعبہ احتساب تھا۔ شعبہ داخلہ، شعبہ خارجہ، شعبہ مالیات، شعبہ عساکر یعنی فوجی نظم و نسق اور شعبہ تعلیم یہ سارے شعبے ایک ایک کر کے قائم کر دیے گئے۔ ([25])

سب سے پہلا اور ابتدائی کام جو نبی کریم ﷺ کو سربراہ ریاست کے طور پر کرنے کی ضرورت پیش آئی وہ شعبہ خارجہ کی تنظیم تھی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مدینہ تشریف آوری کے بعد سب سے اہم کام یہی تھا کہ ان مٹھی بھر مسلمانوں کو دشمنوں کے اس سمندر میں کیسے محفوظ و مامون بنایا جائے ۔ اس غرض کے لیے آس پاس کے قبائل سے روابط ناگزیر تھے۔ دستور مدینہ بھی ایک طرح سے مختلف قبائل کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنے کی بات تھی ۔ اس میں بھی خارجہ معاملات کا ایک عنصر موجود تھا۔ پھر جہینہ، ضمرہ اور مزینہ کے ساتھ جو تعلقات اور معاہدے کیے گئے وہ بھی امور خارجہ کی پہلی کڑی یا پہلا قدم تھا۔ اس سلسلہ کو جاری رکھنے میں نبی کریم ﷺ کے سامنے تین مقاصد تھے۔ یہ وہ مقاصد ہیں جن کی کہیں تو صراحت ملتی ہے اور کہیں ان معاہدات کے الفاظ سے ان کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ سب سے بنیادی ہدف یہ تھا کہ دعوت اسلامی کو فروغ دیا جائے اور اس راہ میں جو رکاوٹیں ہیں ان کو دور کیا جائے۔ چنانچہ مختلف قبائل کے ساتھ ہونے والے معاہدوں میں اس کی طرف اشارے موجود ہیں کہ وہ مسلمانوں کے داعیوں کا راستہ نہیں روکیں گے۔

مسلمان داعی اگر کہیں جارہے ہوں تو ان کو مہمان نوازی اور تحفظ فراہم کریں گے۔ ان کو اپنے ہاں ٹھہرائیں گے۔ اس کے عوض میں مسلمان ان کے ساتھ یہ اور یہ کریں گے۔ ان معاہدات کا دوسرا بڑا مقصد یہ تھا کہ عرب کے معاشرہ میں امن وامان قائم ہو۔ عدل وانصاف کو فروغ ہو اور تمام قبائل کو اس طرح سے ایک لڑی میں پرو دیا جائے کہ وہ ان مشترکہ مقاصد کی خاطر عرب کی تاریخ میں پہلی مرتبہ ایک دوسرے سے تعاون کریں۔ پھر آخری مقصد یہ تھا کہ اسلامی ریاست اور امت مسلمہ کا ایک رعب اور دبدبہ عرب میں قائم ہو کہ کوئی دوسری قوت ان کی طرف میلی نظروں سے نہ دیکھ سکے۔ (26)

رسول اللہ ﷺ کے صیغہ خارجہ میں ایک شعبہ اور بھی تھا جس کو آپ شعبہ مراسلات اور وثائق بھی کہہ سکتے ہیں۔ شعبہ مراسلات اور وثائق کا کام رسول اللہ ﷺ کی خط کتابت اور دوسرے سرداروں اور حکمرانوں سے مراسلت کا ریکارڈ رکھنا تھا۔ اس شعبہ میں سب سے نمایاں خدمات حضرت علی بن ابی طالب اور حضرت زید بن ثابت انجام دیا کرتے تھے۔ (27)

وزارت خارجہ کے ماتحت ایک شعبہ مہمانداری بھی تھا۔ اس کے سربراہ کچھ زمانے تک حضرت بلال رہے۔ پھر ایک صحابی معیقیب بن ابی فاطمہ الدوسی، جو حضرت ابوہریرہ کے قبیلہ کے تھے، اس شعبہ کے نگران ہوئے۔ ان کو آپ افسر مہمانداری یا کہہ لیں کہ چیف آف پروٹوکول کہہ لیں۔ دارالکبریٰ کے نام سے ایک بڑا مکان تھا۔ یہ مکان حضرت عبدالرحمن بن عوف نے مدینہ میں اپنی تجارت چل پڑنے کے بعد بنایا تھا۔ انہوں نے نبی کریم ﷺ کے کہنے پر یہ مکان خالی کر کے شعبہ مہمانداری کو دے دیا۔ یہاں باہر سے آنے والے وفود کو ٹھہرایا جاتا تھا۔ یہ ایک بہت بڑا مکان تھا۔ جب تعمیر ہو رہا تھا تو کئی مرتبہ حضور اس کو دیکھنے کے لئے تشریف لے گئے تھے۔ اس مکان میں کھجوروں کے کئی درخت بھی تھے اور حضور کے مہمان اس مکان میں ٹھہرائے جاتے تھے۔ (28)

رسول اللہ ﷺ نے سراغ رسانی کا شعبہ بھی قائم فرمایا۔ اس کی دو شکلیں تھیں۔ ایک تو یہ کہ بعض افراد مستقل طور پر بعض قبائل میں اس کام پر مامور تھے کہ وہ اس قبیلہ میں اسلام کے خلاف جو بھی تیاریاں ہو رہی ہوں اس کے بارے میں معلومات سے اسلامی ریاست کو مطلع کیا کریں۔ چنانچہ حضرت عباس کے بارے میں کئی لوگوں نے لکھا ہے کہ وہ قریش مکہ کی تیاریوں سے حضور کو مطلع فرماتے رہتے تھے۔ اس کے علاوہ بعض خاص مواقع پر خاص لوگ بھیجے جاتے تھے کہ وہ جا کر پتہ چلائیں کہ دشمن کیا کر رہا ہے اور کیا سوچ رہا ہے۔ (29)

امور خارجہ اور عسکریات کے علاوہ جو سب سے اہم شعبہ تھا وہ صیغہ عدل وقضا تھا۔ اسلام آیا ہی عدل کے لیے ہے۔ اسلام کا بنیادی مقصد ہی یہ ہے کہ لوگ انصاف پر قائم ہو جائیں۔ اس لیے پہلی چیز جس کی طرف میثاق مدینہ میں بھی بار بار اشارہ موجود ہے اور حضور کے انتظامات میں بھی نظر آتا ہے کہ جو پہلا کام کیا گیا وہ عدل وقضا کا بندوبست تھا۔ خود رسول اللہ ﷺ کی حیثیت ایک اعلیٰ ترین عدالت کی تھی۔ آج بھی ہیڈ آف دی اسٹیٹ کو بہت

سے ممالک میں اپیلٹ اختیارات حاصل ہیں۔ پاکستان سمیت دنیا بھر میں ہیڈ آف دی اسٹیٹ کو اپیلیٹ اختیارات حاصل ہوتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کی تو نبی اور سربراہ ریاست کے طور پر دو حیثیتیں تھیں۔ دونوں حیثیتوں میں نبی کریم ﷺ کو آخری عدالت اپیل کا اختیار حاصل تھا۔ اس کے علاوہ حضور نے مختلف قبائل میں الگ الگ قاضی بھی مقرر فرمائے۔ بعض افراد کو معلم اور قاضی دونوں کی ذمہ داریاں دیں۔ چنانچہ مشہور حدیث کے مطابق حضرت معاذ بن جبل کو معلم اور قاضی بنا کر یمن بھیجا گیا۔ اس طرح سے مختلف قبائل میں جو قاضی مقرر تھے وہ فیصلہ کرتے تھے اور ان کا فیصلہ confirmation کے لیے بعض صورتوں میں مدینہ منورہ بھیجا جاتا تھا۔ بعض اوقات یہ بھی ہوا کہ قاضی کو پتہ نہیں چلا کہ اس معاملہ میں صحیح حکم کیا ہے، یا ان کو تامل ہوا تو انہوں نے توثیق کے لیے اپنا فیصلہ حضور ﷺ کو بھیج دیا۔ بعض اوقات رسول اللہ ﷺ از خود suo moto کاروائی کیا کرتے تھے اور خود ہدایت دیتے تھے کہ فلاں معاملہ کا فیصلہ اس طرح کرو۔([30])

گویا اس سے معلوم ہوا کہ پہلی اسلامی ریاست میں ریاستی تنظیم کے لیے نبی کریم ﷺ نے مختلف ادارے متعارف کرائے جنھیں ہم آج کل کی اصطلاح میں وزارتوں سے تشبیہ دے سکتے ہیں اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ریاست نظم وسق کے لیے یہ شعبے بنیاد کی حیثیت رکھتے ہیں جن میں وزارت خارجہ، وزارت داخلہ، وزارت دفاع، وزارت صحت، وزارت مالیہ (فنانس)، وزارت زراعت وغیرہ شامل ہے۔ اس لیے کچھ ایسے بنیادی اداروں کا بھی تصور ملتا ہے جو ان وزارتوں پر نظر رکھتے ہیں جس میں اینٹی کرپشن، نیب، اکاؤنٹ جنرل اور ادارہ احتساب وغیرہ شامل ہیں۔ ادارہ احتساب تو دور جدید میں بہت اہمیت اختیار کر گیا ہے جو حکمرانوں کے اختیارات سے تجاوز اور ان کے اختیارات کے غیر ضروری استعمال پر نظر رکھتا ہے جبکہ حکمران خود کو اس احتسابی نظام سے ماورا تصور کرتے نظر آتے ہیں۔

جہاں تک دور جدید میں حکومتی نظام کا تعلق ہے تو اس بارے میں ڈاکٹر محمود احمد غازی لکھتے ہیں کہ اسلام ہمیں حکومت وفرماں روائی کی کوئی خاص صورت یا نظام اختیار کرنے پر مجبور نہیں کرتا اسے صرف ریاست کی نوعیت سے دل چسپی ہے۔ اگر ریاست اسلامی ہے اور اسلامی نظریے پر یقین رکھتی ہے اور اسلامی قوانین کو نافذ کرتی ہے تو پھر باہمی مشورے سے اسلامی تعلیمات کے مطابق حکومت کا جو بھی نظام اپنایا جائے گا وہ اسلامی نظام حکومت ہوگا۔ یہ نظام وحدانی بھی ہو سکتا ہے اور وفاقی بھی ہو سکتا ہے، صدارتی یا پارلیمانی بھی ہو سکتا ہے یہ تمام مختلف نظام کسی خاص ملک اور دور کی معاشرتی ضرورتوں، ضغرافیائی تقاضوں، ثقافتی ماحول اور ایسے ہی دوسرے حالات کے مطابق اختیار کیے جاتے ہیں۔ تاہم اپنے لیے کوئی نظام حکومت تجویز کرتے وقت ہمیں محض نقالی سے بچتے ہوئے واقعیت پسندانہ اور تخلیقی رویہ اختیار کرنا چاہیے۔([31])

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وقتی تقاضوں کے مطابق اور اسلامی اصولوں کو مد نظر رکھتے ہوئے کوئی سا بھی حکومت کا طریقہ اختیار کیا جا سکتا ہے۔ اس لیے محض دوسروں کو دیکھتے ہوئے کوئی سا بھی طریقی اختیار کرنے کی بجائے اپنے معروضی حالات کو سامنے رکھا جائے تو اس کے دور رس اثرات مرتب ہو سکتے ہیں۔ واضح رہے کہ پاکستان میں اس وقت پارلیمانی نظام رائج الوقت ہے جس میں دو ایوانی مقننہ (پارلیمنٹ اور سینٹ) اس کی پوری

کارروائی پر نظر رکھتی ہے۔ اگرچہ یہ نظام بھی عہد برطانیہ سے درآمد شدہ ہے مگر اس کے بنیادی ڈھانچے اور اصول وضوابط میں وقتی تقاضوں کے مطابق تبدیلی کی ضرورت ہے۔

جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ ملکی نظام کو چلانے کے لیے اسلامی تاریخ میں ہمیں بنیادی طور پر شوریٰ کا تصور ملتا ہے۔ ڈاکٹر محمود احمد غازی اس پر روشنی ڈالتے ہوے لکھتے ہیں کہ قرآن کریم نے شوریٰ کے چند بنیادی اصول بیان کر دیے ہیں تاکہ شوریٰ اور دیگر سیاسی اداروں کا کام انصاف اور حسن و خوبی سے چلتا رہے۔ قرآن مجید نے یہ بات امت پر چھوڑ دی ہے کہ وہ انصولوں کے مطابق شوریٰ کا ڈھانچہ اور نظام شریعت کی حدود میں رہتے ہوئے اور اس کی فراہم کردہ بنیادوں پر وضع کرے اور اس ناگزیر نظام کے وضع کرنے میں امت کو رہنمائی، اجتہاد، اجماع، ملحت اور عرف کے اصول سے حاصل کرنی ہو گی۔ ([32])

اس سے واضح ہوتا ہے کہ باہمی قومی معاملات شوریٰ کے ذریعے چلائے جاتے ہیں۔ اور اس کے لیے نہ صرف اسلامی اصولوں، وقتی تقاضوں اور مستعمل طریق کار کو بھی سامنے رکھا جاتا ہے۔ جہاں تک پاکستان کا تعلق ہے تو پاکستان میں قومی معاملا کو دیکھنے اور اس کا نظم ونسق اور بنیادی اصول و ضوابط بنانے کے لیے پارلیمنٹ کا ادارہ موجود ہے۔ جس میں عوامی نمائندے عام انتخابات کے ذریعے منتخب ہو کر آتے ہیں اور نظام حکومت قائم کرتے ہیں۔

جہاں تک اسلامی ریاست میں پارلیمنٹ کے تصور کی بات ہے تو اس حوالے سے ڈاکٹر محمود احمد غازی رقم طراز ہیں

پارلیمنٹ کو اپنے موجودہ مفہوم کے اعتبار سے بہت سے فرائض انجام دینے پڑتے ہیں اور یہ فرائض ہر ملک میں علیحدہ علیحدہ ہیں انھیں مندرجہ ذیل چھ اقسام میں بیان کیا جاسکتا ہے

۱۔ قانون سازی سے متعلق فرائض	۲۔ انتظامی فرائض
۳۔ مالی فرائض	۴۔ انتخابی فرائض
۵۔ عدالتی فرائض	۶۔ غور وفکر یا بحث ومباحثہ سے متعلق فرائض ([33])

ڈاکٹر محمود احمد غازی پارلیمانی قانون سازی کے دائرہ کار کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں

آج ہم پارلیمنٹ کے قانون سازی اور غور وفکر سے متعلق فرائض کے لیے بنیادی طور پر شوریٰ ہی کو ذمہ دار قرار دے سکتے ہیں۔ شوریٰ کے فرائض اس لحاظ سے انتظامی بھی ہیں کہ وہ حکومت کے انتظامی اور دیگر امور کی نگرانی اور جانچ پڑتال کرتی ہے۔ ہم آج شوریٰ کو قانون سازی کے اختیارات

دے سکتے ہیں، لیکن پارلیمنٹ کی طرز پر تشکیل پانے والی شوریٰ کو اختیارات دینے سے قبل خاصے سوچ وبچار کی ضرورت ہو گی۔ پارلیمنٹ کی تشکیل اس طرح کرنی پڑے گی کہ اس میں شریعت کا علم اور اسلامی کردار رکھنے والوں کی ایک مؤثر اور قابل ذکر تعداد موجود رہے۔([34])

جہاں تک سربراہ حکومت یا امام کا تصور ہے تو ڈاکٹر محمود احمد غازی قاضی ابو بکر الباقلانی (م۴۰۳ھ) کے حوالے سے رقم طراز ہیں

امام جن اختیارات کا استعمال کرتا ہے وہ ان تمام کا استعمال امت کے کارندے اور نمائندے کی حیثیت سے کرتا ہے امت ہمیشہ امام کے پیچھے رہتی ہے تاکہ اس کی اصلاح کرتی رہے۔ اسے صراط مستقیم پر قائم رکھے، اسے یاد دہانی کراتی رہے اور تنبیہ و نصیحت کرتی رہے اور جب کوئی حق اس پر واجب ہو اس سے وصول کرلے اور جب وہ کسی ایسے فعل کا ارتکاب کرے جس کے باعث اس کی برطرفی ضروری ہو اسے معزول کرکے کسی دوسرے شخص کو اس کی جگہ امام مقرر کردے۔([35])

جدید جمہوری نظام میں بھی سربراہ کی برطرفی کا باقاعدہ طریقہ موجود ہے اور پاکستان میں اس مقصد کی عملی تکمیل بھی پارلیمنٹ کے ذریعے تحریک عدم اعتماد کی صورت میں کی جاتی ہے۔ مگر اس جمہوری نظام میں اس کی ضرورت بہت ہی کم پیش آتی ہے چاہیے وہ سربراہ جو مرضی کرتا رہے وہ اپنا دورانیہ مکمل کرکے اپنے عہدے سے الگ ہوتا ہے۔ اور دوسری صورت عوامی انقلاب سے سربراہ ریاست کو معزول کیا جاتا ہے۔ جمہوری نظام میں بظاہر یہ طاقت عوام الناس کو دی جاتی ہے اور جب عوام اس کا اظہار کرنے لگے تو پھر اس کو جمہوریت کے لیے نقصد تصور کیا جاتا ہے اور پاکستان میں اس کا عملی نمونہ میثاق جموریت کے معاہدے کے بعد واضح طور پر دیکھا اور محسوس کیا جاسکتا ہے۔

4۔ قانون کا تصور (منظم حکومت کے اصول وضوابط)

کسی بھی ریاستی نظام میں منظم زندگی گزارنے کے لیے جن اصول وضوابط کا تصور ملتا ہے اسے قانون کا نام دیا جاتا ہے۔ ریاست میں یہ قوانین ریاستی تقاضوں کو مد نظر رکھ کر بنائے جاتے ہیں اور پھر ان قوانین کے نفاذ کو یقینی بنایا جاتا ہے تاکہ ریاستی نظام بھی چلتا رہے، تمام ادارے بھی اپنے دائرے اور حدود میں رہ کر کام کرتے رہیں اور عوام الناس بھی کسی افراط و تفریط سے محفوظ رہیں۔

ڈاکٹر محمود احمد غازی ریاست اور قانون کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ دنیا کے ہر قانون میں ریاست پہلے وجود میں آتی ہے اور ریاست کو چلانے اس میں نظم وضبط قائم کرنے اور اس کے اندرونی اور بیرونی معاملات کو منظم کرنے کے لیے قانون کی ضرورت بعد میں پیش آتی ہے۔ ہر جگہ ریاست پہلے وجود میں آتی ہے اور قانون بعد میں سامنے آتا ہے۔ ریاست مقصود سمجھی جاتی ہے اور قانون اس مقصد کی تکمیل کا ایک وسیلہ اور ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔ اسلام کے نظام میں یہ معاملہ مختلف ہے یہاں ریاست فی نفسہ مقصود بالذات نہیں ہے، ریاست ایک ذریعہ اور وسیلہ ہے قانون الٰہی کو نافذ کرنے کا۔ قانون الٰہی فی نفسہ بالذات ہے۔([36])

قرآن کریم کے بعض احکامات وہ ہیں جن پر عمل درآمد کے لیے حکومت اور ریاست کا ہونا ضروری ہے۔ حکومت ہو گی تو ان احکامات پر عمل ہو گا۔ حکومت نہیں ہو گی تو ان احکامات پر عمل نہیں ہو گا۔ جب ان احکامات پر عمل درآمد نہیں ہو گا تو ان احکامات کے ثمرات و برکات سے امت مسلمہ بھی محروم رہے گی اور بقیہ انسانیت بھی اسلامی نظام زندگی کا عملی نمونہ بڑی حد تک نہ دیکھ سکے گی۔ اس لیے امت مسلمہ کو ایک وسیلہ اور ایک ذریعہ کے لیے ضرورت ہے کہ اس کہ ایک ریاست ہو۔ ریاست جب بنے گی تو اس کا قانون بھی ہو گا، اس کا ایک نظام ہو گا، ہدایات اور احکام ہوں گے، بنیادی تصورات اور قواعد وضوابط ہوں گے۔ ([37])

گویا یہ ایک حقیقت ہے کہ جب ریاست معرض وجود میں آتی ہے تو پھر اس ریاستی تنظیم کے لیے قانون کا ہونا ضروری سمجھا جاتا ہے۔ قانون سے مراد ایک ایسا ضابطہ جس کے تحت اس ریاست کو چلایا جا سکے۔ مملکت پاکستان جس کا حصول بھی اسلام کے نام پر ہوا اور پھر اس کا قانونی ڈھانچہ جو آئین پاکستان کی صورت میں سامنے آیا اسے آئی پاکستان ۱۹۷۳ کا نام دیا گیا۔ گویا یہ بنیادی ضابطہ ہے جس کے تحت پاکستان کا نظام چلایا جاتا ہے اور کسی بھی افراط و تفریط کی صورت میں اسی کے تحت کارروائی کی جاتی ہے۔ مگر دیکھنے میں یہ آیا ہے کہ ہمارے حکمران اپنا سارا زور رعایا پر قوانین کا نفاذ کرانے میں لگا دیتے ہیں اور وہ خود کو اس سے بالا تر تصور کرتے ہیں۔

اسلامی ریاست میں قانون کی مکمل اور حقیقی حکمرانی وہ وصف ہے جس سے اسلامی ریاست بقیہ تمام ریاستوں سے ممتاز ہوتی ہے۔ یہاں قانون سازی آزاد اور حکمرانوں کے اثر رسوخ سے ماوراء ہے۔ حکمران اسی طرح قانون کا پابند ہے جس طرح عامۃ الناس قانون کی پابند ہے۔ جن عدالتوں کے سامنے عامۃ الناس پیش ہوتے ہیں انہی عدالتوں کے سامنے خلفاء بھی پیش ہوتے ہیں۔ جس طرح عامۃ الناس قواعد مرافعہ کے پابند ہیں اسی طرح حکمران بھی پابند ہیں۔ اگر عامۃ الناس کا دعویٰ مسترد کیا جا سکتا ہے تو حضرت علی کا دعویٰ بھی مسترد ہو سکتا ہے۔ ([38])

اسلام کی نظم میں تمام انسان برابر ہیں کوئی حاکم ہو یا راعی، امیر ہو یا غریب۔ ہر صورت میں قانون کا نفاذ سب پر یکساں ہو گا کسی بھی شخص کو اس کا کوئی عہدہ نفاذ قانون سے مستثنیٰ نہیں کر سکتا۔ اس لیے اسلام نے قانونی مساوات پر بہت زور دیا ہے اور دیگر ممالک کی طرح پاکستان میں بھی حکمرانوں کے لیے استثناء کا قانون موجود ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی حاکم کبھی کوئی غلطی کرے تو وہ اس کے لیے جوابدہ نہیں یا قانون کا نفاذ اس پر نہیں ہو گا، جب کہ اگر کوئی عام شخص ویسی غلطی کرے تو اس پر فوری قانون نافذ ہو جائے گا۔ اسوہ رسول ﷺ سے نفاذ قانون کی جو تعلیم ہمیں ملتی ہے اس کی رو سے نفاذ قانون میں تمام لوگ برابر ہیں۔ اس لیے پاکستان میں بھی نفاذ قانون کو یقینی بنانے کی ضرورت ہے اور قانون کے ساتھ ساتھ اخلاقی اقدار کا فروغ بھی ضروری ہے۔

5۔ حکمرانوں کا تصور احتساب

حکمرانوں کو جو اختیارات دیے جاتے ہیں ان اختیارات کے استعمال پر قانونی طور پر نظر رکھنے کا نام احتساب ہے۔ کسی بھی ریاست کے حکمران اور انتظامیہ کے پاس جہاں اختیارات ہوتے ہیں وہیں ان اختیارات اور اپنی ذمہ داریوں کے لیے انھیں جواب دہ بھی ہونا پڑتا ہے، اسی جوابدہی کو بھی احتساب کا نام دیا جاتا ہے۔ اسلام سے پہلے حکمران قانون سے بالا تر سمجھا جاتا ہے اور وہ اپنے کسی فعل کے لیے کسی شخص یا ادارے کو جواب دہ نہیں ہوتا تھا۔ اسلام نے سب سے پہلے جوابدہی کے تصور کو متعارف کرایا۔ نہ صرف تصور دیا بلکہ اس کے لیے قواعد وضوابط بھی متعارف کرائے۔ ابتدائی ادوار میں اس کا تعلق زیادہ تر اخلاقی اقدار سے ہوتا تھا مگر بعد میں اس کو قانونی سانچوں میں بھی ڈھالا گیا۔ لہذا انیسویں صدی عیسویں میں سویڈن نے پارلیمانی احتسابی نظام کو متعارف کرا کر اس کو دستوری حیثیت سے ریاستی نظام کا حصہ بنا دیا۔ دور جدید میں حکمران جوابدہی کو اپنی شان میں گستاخی تصور کرتے ہیں، وہ سمجھتے ہیں کہ وہ عوام سے بالا تر ہیں حالانکہ وہ عوام کا ہی حصہ ہوتے ہیں جو وہ اختیارات ملنے کی وجہ سے بھول جاتے ہیں۔ اسی لیے اچھی حکومتوں کی خوبیوں میں سے ایک خوبی احتساب ہے جو ہمیشہ سے چلی آرہی ہے۔

ڈاکٹر محمود احمد غازی دور جدید کے احتسابی ادارے کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

آج امبڈسمن (Ombudsman) کا ادارہ موجود ہے۔ اومیڈسمن کے ادارہ کا آغاز سویڈن میں نہیں، بلکہ مدینہ منورہ میں ہوا تھا۔ یہ ادارہ نبی کریم ﷺ نے قائم فرمایا اور حضرت عمر فاروق نے اس کو دیوان مظالم کے نام سے ترقی دی۔ دیوان مظالم دراصل ایک اعلیٰ سرکاری عدالت تھی جو اعلیٰ سرکاری حکام اور بااثر لوگوں کی زیادتیوں اور مظالم کے خلاف شہریوں کی شکایات سنا کرتی تھی۔ حضور کے زمانے میں اس کا بندوبست بعض علاقوں میں کیا گیا تھا۔ حضرت عمر فاروق نے اس کو باقاعدہ شکل دی۔ اس کے بعد دنیائے اسلام کے بیشتر مسلم ممالک میں یہ ادارہ قائم رہا۔ اسپین سے اس کو یورپیوں نے سیکھا۔ وہاں سے بعض پادری غرناطہ اور قرطبہ کی درسگاہوں میں اس ادارہ کے بارے میں واقفیت حاصل کر کے گئے۔ انگلستان میں پارلمینٹری کمیشن اور سویڈن میں اومبڈزمین کے نام سے یہ ادارہ بنایا گیا۔ اس وقت دیوان مظالم کے نام سے یہ ادارہ صرف سعودی عرب میں موجود ہے۔ کہا جاتا ہے کہ وہاں یہ ادارہ چودہ سو سال سے مسلسل قائم ہے اور کسی نہ کسی حد تک اسی انداز میں کام کرتا ہے جس انداز میں ماضی میں کام کرتا تھا۔ ([39])

دین اسلام، اپنے پیروکاروں کو باضابطہ طور پر دنیوی زندگی میں حسن کردار کی تعلیم دیتا ہے لہٰذا اسلامی معاشرہ کے قیام میں ہر مسلمان کو اپنی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونا چاہئے، اور یہ محض انفرادی سطح پر نہیں بلکہ اس نصب العین پر اسلامی اخلاق پر کاربند قابل ذکر تعداد کا منظم ہونا ضروری ہے، جو مسلم معاشرہ میں رائے عامہ کی بیداری کا ذریعہ بنے گی جس سے بدی کی قوتوں کا عرصہ حیات تنگ ہو گا اور اس کے نتیجہ میں ایک ریاستی اور انتظامی قوت تشکیل پائے گی۔

اس ضمن میں انہوں نے دو آثار بھی پیش کیے ہیں:

1۔ الاسلام اس والسلطان حارس، فمالا اس له منهدم، ومالا حارس له ضائع ([40])

''یعنی اسلام ایک بنیاد ہے اور حکومت کی حیثیت محافظ کی ہے، جس عمارت کی کوئی بنیاد نہ ہو وہ گر جاتی ہے اور جس عمارت کا کوئی چوکیدار نہ ہو وہ ضائع ہو جاتی ہے اور لوٹ لی جاتی ہے''۔

گویا امت مسلمہ ایک عمارت ہے اس عمارت کی بنیاد شریعت کی تعلیمات ہیں اور حکومت اس کی نگہبان اور محافظ ہے۔

2۔ ان االله ليزع بالسلطان مالا يزع بالقرآن ([41])

''اللہ تعالیٰ ریاست کے ذریعہ ایسے کام لیا ہے جو قرآن (کی محض واقفیت) کے ذریعہ نہیں ہو سکتے) کہ قرآن مجید ذہن سازی اور تربیت کے لیے ہے جبکہ قرآن پاک کے بعض احکام ایسے ہیں جن کے لیے حکومت اور ریاست کا ہونا ضروری ہے۔

علاوہ ازیں ڈاکٹر محمود احمد غازی نے فقہ اسلامی کے قاعدہ کلیہ، مالا يتم الواجب الا به فهو واجب ([42]) کے حوالہ سے بھی کہا ہے کہ اسلامی قوانین کا نفاذ ایک دینی فریضہ ہے جو ریاست کے وجود کے بغیر انجام نہیں دیا جاسکتا، اس لیے اس کا قیام بھی فرض ہے۔([43])

ڈاکٹر غازی کی رائے میں اسلامی ریاست ایک بین الانسانی، رائے عامہ کی نمائندہ اور دینی مگر غیر تقدیسی ریاست ہوتی ہے۔ بین الانسانی ریاست اس اعتبار سے کہ اس کی اساس محض انسان ہونے پر ہوتی ہے۔ اس کی اساس کسی علاقائی یا نسلی یا لسانی تقسیم پر نہیں ہوتی۔ ماضی میں قائم اسلامی ریاست کا جو شخص بھی شہری بننا چاہتا وہ اس کا شہری بن سکتا تھا، اس کے لیے مسلمان ہونے یا نہ ہونے کی شرط نہ تھی، مسلمان بھی اس ریاست کے شہری تھے، غیر مسلم بھی اس ریاست کے برابر کے شہری تھے بلکہ اس ریاست میں غیر مسلموں کا تحفظ زیادہ ہوتا تھا، غیر مسلموں کو خصوصی مراعات کا مستحق سمجھا جاتا تھا، ان کا تحفظ، ریاست اپنی خصوصی ذمہ داری سمجھتی تھی، ریاست کے افراد اس ذمہ داری کو انجام دینا اپنا بنیادی فریضہ سمجھتے تھے۔ علماء کرام اور فقہاء اسلام غیر مسلموں کے تحفظ میں حکمرانوں سے آگے رہتے تھے۔([44])

خلاصہ بحث

جہاں تک ڈاکٹر محمود احمد غازی کے سیاسی نظریات کا تعلق ہے تو آپ نے جس انداز میں اس پر روشنی ڈالی ہے وہ ہمارے لیے غور و فکر کے بہت سے پہلو کھول دیے ہیں جن پر از سر نو غور و فکر کرنے کی ضرورت ہے چاہیے وہ ریاست سے متعلق ہو سیاست سے متعلق ہو، نظام حکومت سے متعلق ہو یا قانون اور قانون سازی سے متعلق ہو۔ آپ نے اپنی فکر میں اسلامی ریاست کے جن مقاصد کی بات کی ہے ان مقاصد کو بھی اپنے ریاستی نظام میں دیکھنے کی

ضرورت ہے۔ ہم جس دور میں ہیں اس میں اسلامی اصولوں کے مطابق ریاستی نظام کو اختیار کرنے میں ترقی کی منازل طے کر سکتے ہیں، لوگوں کے بنیادی حقوق کا تحفظ کر سکتے ہیں اور حکمران اور رعایا کے جو تعلقات ہیں ان میں بھی نکھار لا سکتے ہیں۔ ایک ایسی مملکت کا قیام جس میں قانون کا نفاذ ہو، اسلامی قوانین کے مطابق ریاستی قوانین تشکیل دیے جائیں اور قانون کے نفاذ میں اخلاقی اقدار کو بھی فروغ دیا جائے۔

حوالہ جات:

[1] ۔ ڈاکٹر محمود احمد غازی، ادب القاضی، ادارہ تحقیقات اسلامی اسلام آباد، طبع سوم ۱۹۹۹ء، ص ۳۶۸

[2] ۔ شاہ ولی اللہ، ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء، لاہور ۱۹۷۶، ج ۱، ص ۲

[3] ۔ ڈاکٹر محمود احمد غازی، ادب القاضی، ص ۳۶۹

[4] ۔ محمود احمد غازی، ڈاکٹر، محاضرات شریعت، الفیصل ناشران وتاجران کتب لاہور ۲۰۰۹ء، ص ۲۸۷

[5] ۔ محمود احمد غازی، محاضرات شریعت، ص ۲۸۷

[6] ۔ محمود احمد غازی، اسلامی ریاست عصر حاضر میں، فکر و نظر اسلام آباد ۱۹۸۳، جلد ۲۱، شمارہ نمبر ۲، ص ۱۰

[7] ۔ محمود احمد غازی، اسلامی ریاست عصر حاضر میں، فکر و نظر اسلام آباد ۱۹۸۳، جلد ۲۱، شمارہ نمبر ۲، تلخیص ص ۱۸تا۲۱

[8] ۔ محمود احمد غازی، ڈاکٹر، محاضرات شریعت، ص ۳۰۵

[9] ۔ محمود احمد غازی، ڈاکٹر، محاضرات فقہ، الفیصل ناشران وتاجران کتب لاہور، ص ۳۷۸

[10] ۔ محمود احمد غازی، محاضرات فقہ، ص ۳۷۲

[11] ۔ محمود احمد غازی محاضرات شریعت، ص ۲۹۴

[12] ۔ محمود احمد غازی، حاضرات فقہ، ص ۳۷۲

[13] یہ اسلام سے ساڑھے تین سو سال پہلے گزرا ہے اور عربی زبان کے قدیم ترین شعراء میں سے ہے

[14] محمود احمد غازی، محاضرات فقہ، ص ۲۹۱

[15] ۔ تدبیر سے مراد موجود مخلوقات کا نظم و نسق اور بندوبست ہے۔ اللہ تعالیٰ کی تدبیر دو طرح کی ہوتی ہے ایک کو تدبیر تکوینی کہتے ہیں جو کاینات کے فطری قوانین کا نام ہے۔ دوسری تدبیر تشریعی ہے یعنی وہ ہدایات جو اللہ نے پیغمبروں کے ذریعے نازل فرمائی، ان کا مقصد انسانی معاملات کی تدبیر، نظم و نسق اور بندوبست ہے۔ یہ تدبیر فرد کی بھی ہوتی ہے، خاندان کی بھی ہوتی ہے، ریاستوں اور معاشروں کی بھ ہوتی ہے۔ (محمود احمد غازی، حاضرات شریعت، ص ۲۷۴)

[16] ۔ محمود احمد غازی، محاضرات شریعت، الفیصل ناشران وتاجران، اردو بازار لاہور ۲۰۰۹ء، ص ۲۷۳

[17] ۔ محمود احمد غازی، محاضرات شریعت، ص ۲۷۶

[18] ۔ محمود احمد غازی، محاضرات شریعت، ص ۲۷۷

[19] ۔ محمود احمد غازی، اسلامی ریاست عصر حاضر میں، فکر و نظر ۱۹۸۳، جلد ۲۱، شمارہ نمبر ۲، ص ۲۲

[20] ۔ محمود احمد غازی، محاضرات سیرت، ص ۳۲۱

[21] ۔ ایضاً

[22] ۔ محمود احمد غازی، محاضرات سیرت، الفیصل ناشران وتاجران لاہور، طبع پنجم ۲۰۱۵، ص ۳۲۱۔۳۲۲

23 ۔ محمود احمد غازی، محاضرات سیرت، ص۳۲۲

24 محمود احمد غازی، محاضرات سیرت، ص۳۲۶

25 حمود احمد غازی، محاضرات سیرت، ص۳۴۵

26 ۔ حمود احمد غازی، محاضرات سیرت، ص۳۴۵۔۳۴۶

27 ۔ حمود احمد غازی، محاضرات سیرت، ص۳۴۸

28 ۔ حمود احمد غازی، محاضرات سیرت، ص۳۳۸۔۳۴۹

29 ۔ محمود احمد غازی، محاضرات سیرت، ص۳۵۴

30 ۔ محمود احمد غازی، محاضرات سیرت، ص۳۵۵

31 ۔ محمود احمد غازی، اسلامی ریاست عصر حاضر میں، فکر و نظر ۱۹۸۳، جلد ۲۱، شمارہ نمبر ۲، ص ۲۱

32 ۔ محمود احمد غازی، اسلامی ریاست عصر حاضر میں، فکر و نظر ۱۹۸۳، جلد ۲۱، شمارہ نمبر ۲، ص ۲۱

33 ۔ محمود احمد غازی، اسلامی ریاست عصر حاضر میں، فکر و نظر ۱۹۸۳، جلد ۲۱، شمارہ نمبر ۳، ص ۱۳

34 ۔ محمود احمد غازی، اسلامی ریاست عصر حاضر میں، فکر و نظر ۱۹۸۳، جلد ۲۱، شمارہ نمبر ۳، ص ۲۰۔۲۱

35 ۔ علامہ تفتازانی، شرح المقاصد، ج ۲، ص ۲۷۲

36 ۔ محمود احمد غازی، محاضرات فقہ، ص ۲۱۵، محاضرات شریعت، ص ۲۹۳۔۲۹۴

37 ۔ محمود احمد غازی، محاضرات فقہ، ص ۱۸۳۔۱۸۴

38 ۔ محمود احمد غازی، محاضرات شریعت، ص ۲۹۶

39 ۔ محمود احمد غازی، محاضرات سیرت، ص ۳۵۶۔۳۵۷

40 ۔ النیسابوری، الحسن بن محمد بن حسین نظامی، غرائب القرآن ورغائب القرآن، تحقیق شیخ زکریا عمیرات، دار الکتب العلمیہ بیروت ۱۴۱۶ھ، ج ۱، ص ۶۷۳

41 ۔ ابن کثیر اسماعیل بن عمر، ابوالفداء، الدمشقی، تفسیر القرآن العظیم، تحقیق محمد حسین شمس الدین، دار الکتب العلمیہ بیروت، ج ۵، ص ۱۰۲

42 ۔ ولید بن راشد السعیدان، تلقیح الافہام بشرح القواعد الفقہیہ، مرقم آلیا، ج ۳، ص ۲۰

43 ۔ محمود احمد غازی، محاضرات شریعت، ص ۲۸۶

44 ۔ حمود احمد غازی، محاضرات شریعت، ص ۲۹۲۔۲۹۳